مقالات

اساس دین کی تعمیر

(۲)

از جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی

(۲) ایمان بالآخرت اس بنیاد کا دوسرا پتھر ایمان بالآخرت ہے یعنی ایک ایسے روز جزا کے آنے پر کامل یقین جس میں اعمال انسانی کا خالص اخلاقی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیا جائے گا، اور جب اللہ تعالےٰ کا دست عدل وحکمت آگے بڑھے گا اور بڑھ کر ہمارے شعور وکردار کے چہرہ سے اس دارالعمل میں کام کرنے والے قوانین طبیعی کی نقاب الٹ دے گا۔ جس کے بعد ہر نفس مجبور ہوگا کہ جو کچھ اس نے دنیا میں کیا ہے اس کے اخلاقی نتائج سے دوچار ہو۔

ایمان بالآخرت کی اصل وحقیقت یہ بات، کہ ایک یوم جزا آنے والا ہے، قرآن میں جس اہتمام سے بیان ہوئی ہے اس کو دیکھ کر عام ذہن تو یوں محسوس کرتا ہے کہ یہ بھی ایمان باللہ کی طرح اپنی ایک مستقل اصل اور حیثیت رکھتی ہے۔ مگر فی الواقع یہ اسی ایمان باللہ کی ایک فرع ہے، یا یوں کہیئے کہ اس کا ایک قریب ترین مقتضا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ ایمان باللہ کے معنی ہیں ذات خداوندی اور صفات باری تعالےٰ کا ٹھیک ٹھیک تصور اور اذعان۔ ان صفات میں جو صفتیں نمایاں ترین ہیں اور جن کے جلوے ہر سمت چھائے نظر آتے ہیں۔ ان میں عدل، حکمت اور رحمت کی صفات بھی ہیں۔ یہ تینوں صفات چاہتی ہیں اور اپنا پہلا مطالبہ ہی یہی پیش کرتی ہیں کہ ایک نہ ایک دن جزا وسزا کی میزان آویزاں کی جائے، ورنہ یہ صفات ناقص، اور کمال سے عاری قرار پاتی ہیں۔ اور ناقص اور کمال سے عاری صفات ذات الٰہی سے اس وقت تک منسوب نہیں کی جاسکتیں جب تک کہ وجوب و امکان کے معنے ایک نہ سمجھ لئے جائیں اور خالق کو مخلوقات کی صف میں نہ لا کھڑا کیا جائے۔ رہا یہ سوال، کہ یہ صفتیں ایک یوم جزا کے آنے کو کیونکر مستلزم اور متقاضی ہیں، تو یہ اپنے جواب کے لئے غور و بحث کی ایک طولانی تفصیل

چاہتا ہے، جس کا یہ موقع نہیں، اس لئے یہاں صرف چند سرسری اشارات پر ہی اکتفا کیا جائے گا۔

اقتضائے عدل عدل کے معنی ہیں کانٹے کی تول حق رسانی، یعنی جو شخص جس حق اور جس برتاؤ کا مستحق ہو وہ ٹھیک ٹھیک اس کے سامنے رکھ دیا جائے۔ پس اگر اللہ تعالیٰ عادل ہے تو اس کا مجرد عادل ہونا ہی تقاضا کرتا ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک بدلہ ملے۔ اس نے جو اخلاقی حدود مقرر کیے ہیں ان کی پابندی کرنے والے کو اپنی خوشنودیوں اور نعمتوں سے شادکام کرے اور جو ان حدود کا پاس نہ کرے اس کو قرار واقعی سزا دے۔ عدل و انصاف کا یہ وہ بنیادی اصول ہے جس سے آج تک اختلاف ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ دنیا میں کسی نے بھی دوست اور دشمن، فرمانبردار اور نافرمان، اطاعت کیش اور باغی دونوں کو ایک برتاؤ کا اہل نہیں سمجھا ہے، تو یہ گمان کیسے کیا جا سکتا ہے کہ وہ ذات جو سراپا عدل و انصاف ہے، وہ اپنے وفاداروں اور باغیوں میں تمیز نہ کرے گی! چنانچہ اس نے خود ان لوگوں سے جو اپنی بدکرداریوں اور نافرمانیوں میں ڈوبے ہوئے تھے اور اپنے اعمال بد کے انجام سے بے فکر تھے، حیرت بھرے انداز میں پوچھا اور بار بار پوچھتا رہا کہ نادانو! جب یہ ایک حقیقت ہے کہ اندھا آنکھوں والے کے، تاریکی روشنی کے، سایہ دھوپ کے اور مردہ زندہ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ (مَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ)۔ اور تم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے تو پھر تمہارے دماغ میں، بقائمی ہوش و حواس، اتنی بڑی بے عقلی کی بات کیونکر سما جاتی ہے کہ ہم مسلم اور مجرم دونوں کو ایک سطح پر رکھیں گے؟ (أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ؟)۔

غرض نیکو کاروں کو اچھا اور بدکاروں کو برا بدلہ ملنا، اور ان کے اعمال کے عین مطابق ملنا عدل خداوندی کا سب سے پہلا اور لازمی تقاضا ہے۔ مگر اس دنیا میں عملاً ہو کیا رہا ہے؟ کیا ایسا نہیں کہ یہاں کی خوش حالیاں، یہاں کی زینتیں، یہاں کی نعمتیں یہاں کی سربلندیاں بالعموم ان کو نہیں ملتیں جو اہل حق ہیں، بلکہ اُلٹی ان کے حصہ میں آتی ہیں جو حق کے دشمن اور احکام الٰہی کی دھجیاں اڑانے والے ہیں؟۔ اسی طرح کیا وہ جو ان احکام کی پیروی کرتے ہیں ان کے گرد و پیش بدحالیاں، گمنامیاں، فلاکتیں مظلومیتیں نہیں چھائی رہتی ہیں؟ کیا یہاں ایسا نہیں ہوتا کہ بدی، ظلم، کیادی اور بے ایمانی کی راہ دولت و عزت کے عشرت کدوں میں لے جاتی ہے اور نیک روی، حسن خلق، حق شناسی

اور خدا پرستی کا راستہ ان خارزاروں میں پہنچا دیا کرتا ہے جہاں دل شکنیوں، مشکلوں اور مصیبتوں کے کانٹے انسان کے جسم و روح کو چھلنی بنا دیتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہاں یہی سب کچھ ہو رہا ہے اور ہماری آنکھیں نت اسی حقیقت کا مشاہدہ کرتی رہتی ہیں۔ تو اگر کوئی دوسرا عالم نہ برپا ہو اور کوئی ایسا دن نہ آئے جس میں اس صورت حال کو پلٹ دیا جائے اور ہر شخص کا حساب اس کے اعمال کے صحیح استحقاق کے مطابق چکا دیا جائے تو خدا کا وہ عدل کہاں رہا جو اس کی بدیہی صفات کمال میں سے ہے! اس لیے اگر خدا عادل ہے تو ایک یوم الحساب کا آنا اس کے عدل کا ویسا ہی لازمہ ہے جیسا کہ عدل اس کی خدائی کا۔

اقتضائے حکمت اب صفت[۲] حکمت کو لیجیے۔ حکیم کہتے ہی اس کو ہیں جس کا کوئی فعل حکمت اور مقصدیت سے خالی نہ ہو۔ جو جتنا بڑا حکیم ہوگا۔ اس کے افعال اتنے ہی زیادہ با مقصد اور پُر از حکمت ہوں گے۔ یہ ایک عام مسئلہ ہے، اور علم منطق کے ابتدائی بدیہیات میں سے ہے۔ اس بدیہی حقیقت کی روشنی میں اس حکیم و دانائے مطلق کے افعال و شئون پر نگاہ ڈالیے جو سراپا حکمت اور منبع حکمت ہے۔ یہ کارگاہِ عالم، جو آپ کی نگاہوں کے سامنے اور آپ کی حدود نظر میں ہے، اسی حکیم کے کارناموں کا ایک باب ہے۔ اس پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ یہ عظیم الشان کائنات، جس کے تمام اجزا منظم طور پر سعی و حرکت میں لگے ہوئے ہیں، جس کے مختلف حصوں میں کامل توافق اور ہم آہنگی نظر آ رہی ہے، جس کا ایک ایک ورق علت و معلول کے ناقابل شکست شیرازہ میں بندھا ہوا ہے، کیا یہ کائنات اپنی تخلیق کے پیچھے کوئی غایت نہیں رکھتی؟ جس کائنات کا ہر جزو اپنی جگہ نہایت کھلے ہوئے مقاصد کا حامل ہے، کیا وہ بحیثیت مجموعی اپنا کوئی ایک مقصد بھی نہیں رکھتی؟ یعنی کُل کا ہر جزو تو، بجائے خود با مقصد ہو، مگر کُل بحیثیت کُل بے مقصد ہو! عقل سلیم اسے کیسے مان سکتی ہے؟ اور پھر یہ انسان جس کو عقل و فکر کی بے نظیر صلاحیتیں اور سعی و عمل کی حدود نا آشنا قابلیتیں دے کر بھیجا گیا ہے، کیا اس کی آفرینش مقصدیت سے تہی دامن ہو سکتی ہے؟ جس انسان کی چاکری میں زمین کے ذروں سے لے کر آسمان کے آفتاب و ماہتاب تک لگے ہوئے ہوں وہ خود کسی غایت و مقصد کی غلامی سے آزاد ہے؟ خالق کائنات کو حکیم ماننے والا اس سوال کا جواب اثبات میں کیسے دے سکتا ہے۔ اس کی بصیرت کی نگاہیں تو جب ان حقائق کو دیکھیں گی تو اس کا دل بے اختیار پکار اُٹھے گا کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ اور وہ جب بھی خدا کی صفت حکمت کا تصور کرے گا اس کی زبان زبان الٰہی سے ہم نوا ہو کر

باندازِ استعجاب دنیا سے سوال کرے گی کہ:

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى (قیامہ-۲)
کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اسے یونہی چھوڑ دیا جائیگا؟

اور یہ کہ:-

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ - (مومنون-۶)
کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم بلاکسی مقصد کے پیدا کئے گئے ہو اور تمہیں اپنے خالق کے روبرو لوٹ کر جانا نہیں ہے؟

اقتضائے رحمت | رہی صفتِ رحمت، تو اس کا بھی تقاضا یہی ہے کہ ایک یوم مکافات برپا ہو، تاکہ ان بندگانِ حق کی سعی و جہد کا، جو دنیا میں محض خدا کی خاطر مصائب و آلام کا شکار ہوئے خالق کی طرف سے اعتراف کیا جائے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی رحمانیت اپنی آغوشِ شفقت میں لے کر اس طرح ان پر سے رنج و غم کے غبار کو جھاڑ دے جس طرح ایک ماں اپنے نوابزادہ لاڈلے بچے کی بلائیں لے کر اس کو دلشاد کرتی ہے جب کہ وہ اس کے حکم کے بموجب کسی کٹھن مہم میں اپنے پسینے بہاکر واپس آیا ہو۔ ورنہ خدا کا رحیم ہونا تو درکنار، اس کو بے مروتی اور سنگ دلی سے بری ثابت کرنا بھی ممکن نہ رہے گا۔ تعالیٰ اللہ عنہ۔ پس اس کی رحمت گواہ ہے اس بات پر کہ ایک یوم ہوا آکر رہے گا۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جو خود قرآن کے اشارات میں واضح طور پر موجود ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:-

كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ - (انعام-۲)
اس نے اپنے اوپر رحمت لازم کر لی ہے (اس لئے) وہ قیامت کے دن تم سب کو ضرور جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔

ایمان بالآخرت کی اہمیت | اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک ایمان بالآخرت کی اصل و حقیقت کا تعلق ہے وہ فی الواقع ایمان باللہ ہی کی فرع ہے اور اس لئے اس کے مقابلہ میں اس کی حیثیت ثانوی ہے، جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے آشکارا ہو چکا، مگر دینِ حق کی اطاعت و اقامت کے زاویۂ نظر سے، اور انسانی زندگی پر اپنے اثرات کے لحاظات سے یہ اس کے مقابلہ میں کسی طرح بھی کم اہمیت کا مالک نہیں، بلکہ بعض اعتبارات سے تو اس سے بھی بڑھ کر ہے انسان کی حیوانی جبلت میں جو عجلت پسندی، ظاہر طلبی، عاجلہ پرستی ودیعت کی گئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے کسی طرح بھی باور نہیں کیا جا سکتا کہ اگر انسان کو اپنے اعمال کی بازپرس کا اندیشہ نہ ہو تو وہ نیکی و حق پرستی کی سنگلاخ وادی

قطع کرنے پر تیار ہوگا - اس کو خدا کی ذات اور اس کی یکتائی کا لاکھ یقین ہو، مگر جب اسے یہ معلوم ہو کہ میرے ہر عمل کا آخری اور قطعی انجام وہی ہے جو اس دنیا میں ظاہر ہوتا ہے اور موت کا پردہ گرتے ہی زندگی اور اس کی تمام حرکات کا تماشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوجانے والا ہے، تو نرا نادان ہی ہوگا اگر اس نے "بعیش کوش" کے فتوے پر عمل نہ کیا، اور دنیا اس کی بدقسمتی کا ماتم ہی کرے گی اگر اس نے جی کھول کر داد نفسانیت نہ دی[۱]۔ بخلاف اس کے اگر اس کو قیامت کے آنے اور اعمال کا حساب کتاب لئے جانے کا پورا یقین ہو تو بہرحال اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے نفس کو کسی نہ کسی اخلاقی ضابطہ کا پابند رکھے گا، نہ صرف وحدانیت کا قائل ہونے ہی کی صورت میں،

۱؎ بعض صوفیہ کا یہ کہنا کہ "جس نے قیامت کے اندیشے اور عذاب دوزخ کے خوف اور جنت کے لالچ سے حق پرستی اور طاعت و بندگی کی راہ اختیار کی، اس نے فی الحقیقت شرک کیا۔ مومن کی شان یہ ہے کہ جنت دوزخ سے بے نیاز ہو کر خدا کی والہانہ بندگی محض اس بنا پر کرے کہ وہی تمام صفات جمال و کمال کا جامع اور وہی حسن مجسم ہے، نہ کہ کسی خوف اور لالچ کی بنا پر" یہ دراصل عالم جذب اور جوش محبت میں نکلے ہوئے الفاظ ہیں جن میں حقیقت سے زیادہ شاعرانہ غلو کار فرما ہے۔ یہ تو عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور انابت کی کثرت کسی خاص مقام پر پہنچ کر روح انسانی میں ایسی وارفتگی اور انجذابی کیفیت پیدا کردے کہ اس کے احساسات پر سے اندیشہ جزا و سزا کے نقوش قریباً ناپید ہوجائیں اور صرف محبت ہی محبت کے جذبات چھائے ہوئے رہ جائیں، مگر یہ امکان کبھی بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ اول روز ہی سے یہ کیفیت حاصل ہو سکتی ہے اور انسان آخرت کے کھٹکے کو اپنے دل میں جگہ دیئے بغیر ہی اس راہ دشوار پر قدم رکھ سکتا ہے، بلکہ ضروری ہے کہ خدا پرستی کے آغاز میں خوف آخرت ایک اہم عنصر بلکہ شاید اصل محرک کی حیثیت رکھتا ہو۔ اس محرک کے بغیر نفس انسانی بندگی کی قیود برداشت کرنے پر ہرگز آمادہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں آگے چل کر جب محبت کے جذبات تیز تر ہوجائیں، اس سے بے نیازی برت سکتا ہے، اگرچہ یہ بے نیازی بھی خطرات سے خالی نہیں اور واقعات بتاتے ہیں کہ کتنے ہی ارباب سلوک اسی ترنگ میں اپنے آپ کو تباہ کر بیٹھے۔ اسی لئے مومن کی صفت شریعت کے مزاج شناسوں نے یہ بیان کی ہے کہ "مومن وہ ہے جو خدا کی بندگی بیک وقت خوف اور رجا اور محبت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کرے، اسی نقطہ سے آغاز بھی کرے اور اسی پر اس کا انجام بھی ہو۔" چنانچہ قرآن مجید نے جہاں سچے مومنوں اور رحمت الٰہی کے اہل ترین بندوں کی یہ خصوصیت بتائی ہے کہ ان کی محبت کا اصل مرکز ذات الٰہی ہے (وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ)، وہاں ان کے متعلق یہ بھی کہا ہے — پورے مدح سرایانہ انداز میں کہا ہے اور ان کے کمال بندگی پر اپنی مہر رضا ثبت کرتے ہوئے کہا ہے: (باقی صفحہ ۱۶۶ پر دیکھو)

بلکہ ـــ اگر ایسا عملاً ممکن ہو ـــ مشرک ہوتے ہوئے بھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ مشرکانہ عقاید خدا کے ہاں اس کے اعمال کو میزانِ محاسبہ میں بے وزن بنا دیں۔ لیکن جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے ایک مشرک کا ایک منکرِ قیامت کے مقابلہ میں کسی ضابطۂ اخلاق کا پابند ہونا اور ہوائے نفس کے ہاتھوں میں بالکلیہ اپنی زمام کار سونپ دینے سے مجتنب رہنا بہرحال زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس لیے ایمان بالآخرت کو ایمان باللہ کے برابر یا بعض اعتبارات سے اس سے بڑھ کر اہمیت دینا خلاف واقعہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جس شد و مد اور جس تفصیل و تصریف کے ساتھ توحید پر دلائل دیے ہیں، معاد کے وقوع پر آفاق و انفس کی محکم اور دل نشیں شہادتیں بہم پہنچانے میں اس سے کم زور نہیں صرف کیا ہے۔ قرآن پر نگاہ ڈالیے تو صفحے کے صفحے، اور کئی سورتوں میں تو قریب قریب پوری سورتیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۵)

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ۔

(المومن - ۴)

اور وہ لوگ، جو راہ خدا میں جو کچھ دیتے ہیں اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل اس اندیشے سے کانپ رہے ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا .... اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا

(الدھر - ۱)

(یہ ابرار اور "عباد اللہ" وہ ہیں جو) اپنی نذروں (یعنی واجبات دینی) کو پورا کرتے ہیں اور اس بڑے دن سے ڈرتے ہیں جس کی ہولناکی عام اور ہمہ گیر ہوگی .... (وہ کہتے ہیں کہ) ہم اپنے رب کی طرف سے ایک سخت اور تلخ دن کا خوف کھاتے ہیں (اور اسی لئے یہ اعمالِ صالحہ کرتے ہیں)

اس قسم کی آیات قرآن میں ایک دو نہیں، بے شمار ملیں گی۔ ان آیات میں معمولی اہل ایمان کی صفات نہیں بیان کی گئی ہیں بلکہ ان میں اُن اصحابِ ایمان کے ایمان کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو معیاری مومن ہیں، جن کو "اَلْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا" کہا گیا ہے، جن کو الابرار کے خطاب سے نوازا گیا ہے، جن کو "عباد اللہ" اور "عباد الرحمٰن" کی سند محبوبیت مرحمت فرمائی گئی ہے۔ ان آیات میں کامل المعیار ایمان کا یہ نقشہ دیکھیے اور اندازہ کیجیے کہ آخرت پر ایمان اور یوم الحساب کا خوف اس نقشہ میں اپنا نشان کتنا نمایاں رکھتا ہے اس کو دیکھ کر کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ نیکی و تقویٰ اور سچی بندگی کا حق ادا کرنے میں، (باقی صفحہ ۱۶۷ پر دیکھو)

قیامت کے پُر ہول اور وحشت ناک کوائف کے ذکر، اور اس کے وقوع کے امکان، اور اس کی ضرورت کے دلائل سے لبریز نظر آئیں گی، جو شہادت ہے اس امر کی کہ قرآن کے نزدیک عقیدۂ آخرت کا دلوں میں اذعان پیدا کرنا (توحید کے بعد) تمام حقائق دینی سے اہم تر اور مطلوب تر ہے۔ جس قرآن کے اعجاز و بلاغت کی قسمیں کھائی جاتی ہیں اس کا کسی امر کے ساتھ یہ اعتناء کہ اپنے الفاظ کا ایک معتدبہ حصہ وہ اسی کے اثبات و استشہاد اور اسی کی تلقین و تصریف بیان کی نذر کر ڈالے، اس بات کا ایک ناقابل تردید ثبوت ہے کہ اس کی نگاہ میں اس ایک امر کی دوسرے حقائق دینی پر وہی فوقیت ہے جو فوقیت آفتاب کو اپنے گرد گھومنے والے کروں پر حاصل ہے۔ جس طرح آفتاب کا مرکز کشش ان تمام اجرام فلکی کے قیام و بقا، اور اس کا سرچشمۂ نور ان سب کی تابناکیوں کا ضامن ہے اسی طرح یہ عقیدۂ آخرت (عقیدہ توحید سے ہم دست ہو کر) ساری نیکوکاریوں کا کفیل ہے۔ اگر اس عقیدہ کو یہ اہمیت حاصل نہ ہوتی تو وہ قرآن، جس نے نماز جیسی عبادت کا صرف حکم دینے پر اکتفا کر لیا اور اس کے احکام، اس کے طریق ادا اور اس کی رکعات اور ارکان وغیرہ کی تفصیلات بیان کرنے پر چند کلمات کہنا اور چند لمحے دینا بھی غیر ضروری سمجھا، وہ اس کے بیان کے سلسلے میں الفاظ اور اوقات کے اس بے دریغ خرچ سے ہرگز کام نہ لیتا جس کا مشاہدہ قرآن کے صفحات میں ہم کر رہے ہیں۔

ایمان بالآخرت کی یہی اہمیت ہے جس کے باعث اس کو ایمان باللہ کا ایک جزو اور فرع ہونے کے باوجود اساس دین کی تعمیر میں ایک مستقل سنگ بنیاد کی حیثیت دی گئی ہے، جب کہ دوسرے تمام ایمانیات کو اس مقام کا مستحق نہ سمجھا گیا۔ کیونکہ یہی دو ایمانیات ایسے ہیں جن کے صحیح تحقق پر انسانی زندگی کے سنورنے اور منشائے الٰہی کے مطابق بسر ہونے کا انحصار ہے۔ یہ دراصل دو پہیے ہیں جو اعمال انسانی کی گاڑی کو بندگی اللہ اطاعت حق کی شاہراہ پر چلاتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک پہیہ بھی غائب یا بیکار ہو جائے تو یہ گاڑی کبھی بھی اس راستہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۶) قیامت کا یقین ایک مرکزی حیثیت اور ضروری شرط کا درجہ نہیں رکھتا ہے! حد یہ ہے کہ اس مقرب ترین اور محبوب ترین بندے کی زبان سے بھی، جس کا تقرب ناقابل تصور اور جس کی محبت اور محبوبیت ماورائے تمنا ہے، اطاعت حق پر جمے رہنے اور نافرمانی رب سے مجتنب رہنے کی وجہ یہ ظاہر کرائی جا رہی ہے کہ "ایک یوم عظیم کی سزا کا خوف ہے"۔ قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ پھر تا بدیگراں چہ رسد۔ (ص ۱۰)

پر نہیں چل سکتی۔ ایسی صورت میں یہ گاڑی شیطان کے ہاتھ میں پہنچ جاتی ہے جو اس کو اس شاہراہ حق سے ہٹا کر شر و طغیان کی سنگلاخ وادیوں میں گھسیٹتا پھرتا اور انجام کار ہلاکت کے گہرے کھڈ میں ڈال دیتا ہے۔ یہی ہدایت اور یہی اطاعت کے لیے ان دونوں عقائد کی یہی یکسانی۔ اور باعتبار حصول مقصد ایک کی دوسرے کی طرف یہی شدت احتیاج ہے جس کے سبب قرآن حکیم نے دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر کرنے کا اسلوب بیان پورے اہتمام کے ساتھ اختیار کیا ہے اور جہاں کہیں بھی اس نے توحید کی تعلیم وہدایت اور اس کے دلائل سے گفتگو کی ہے، وہاں بالعموم قیامت کے ذکر و اثبات سے ضرور تعرض کیا ہے۔ اور اسی طرح اس کے برعکس بھی۔ اس اہتمام کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان کو اس کی مرغوباتِ نفس سے روک کر اطاعت الٰہی اور نیکی و تقویٰ کے تلخ نوالوں کو حلق سے نیچے اتارنے پر آمادہ کرنا نہ تو تنہا عقیدۂ توحید کے بس میں ہے اور نہ ہی عقیدۂ آخرت کے امکان میں۔ تنہا توحید اس سے مطالبہ کرے گی کہ خدا کا حق پہچانو اور اس کے احکام کی پابندی کرو، وہ جواب دے گا جب مجھے مرنے کے بعد نسیاً منسیاً ہو جانا ہے اور خدا کے سامنے نہ حاضری دینی ہے اور نہ ہی اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے تو خواہ مخواہ طاعت و بندگی کا یہ بار گراں اپنی گردن پر کیوں لادے پھروں؟ اسی طرح اگر قیام قیامت کا یقین اس سے کہے کہ اللہ تعالیٰ کے فلاں فلاں حدود کی پابندی کرو، وہ فوراً جواب دے گا کہ نیچر نے مجھے پیدا کیا ہے، وہی مجھے فنا کرے گا اور وہی اس پوری کائنات کو بھی ایک روز تباہ کر کے رکھ دے گا، یہ بیچ میں "اللہ تعالیٰ" کون سی چیز ہے جس کے کچھ حدود بھی ہیں، جن کی مجھے پابندی کرنی ہے؟ یا اگر وہ وجود الٰہی کو مانتا ہوگا مگر ساتھ ہی توحید کا قائل نہ ہوگا تو یوں کہے گا کہ "خدا کا خالق کائنات ہونا برحق؛ اس کا رب اعلیٰ ہونا بھی بجا، اور قیامت کا آنا بھی یقینی، مگر یہ ارواح عظیمہ، یہ انبیاء و ملائکہ، یہ اقطاب و بزرگان دین جن کی ہم نذریں چڑھاتے ہیں، جن کے تھانوں اور مزاروں پر ہم سالانہ یا ماہانہ یا ہفتہ وار سجدے کر لیا کرتے ہیں اور جن کو خوش رکھنے کے لیے ہم کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔ یہ سب قیامت میں اعمال کی ترازو اٹھنے کب دیں گے اور ہمارے حساب کتاب کا دفتر کھلنے کیوں پائے گا۔ ان کی ایک سفارش ہماری بخشش کے لئے کافی ہوگی۔ اس لئے خدا کے احکام اور حدود کی بحث سے ہمیں کیا بحث!"

ایمان بالآخرت اور دنیا پرستی میں تضاد

تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی کسی قوم میں اخلاقی بگاڑ اور مادہ پرستانہ طرز عمل رونما ہوا ہے اسی وقت ہوا ہے جب کہ اس کے اندر سے توحید کا تصور اور آخرت کا خوف رخصت ہو چکا تھا،

یا اگر تھا بھی تو اتنا دھندھلا اور اس قدر بے جان کہ اس کے معاملات زندگی پر اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد اس کی تمام تر توجہات کا مرکز یہی دنیا بن گئی اور دوسرے عالم کے تصور کو اس کی قطعاً اجازت نہ تھی کہ وہ اس کے دماغ کو پریشان کرے۔ اور اگر کبھی "سوے اتفاق" سے یہ تصور سامنے آتا بھی تو اس کو یہ جواب دے کر رخصت کر دیا جاتا کہ یہ "امت مرحومہ" کا حلقہ ہے، اس کے اندر داخل ہو جانا ہی حسن عاقبت کی گارنٹی ہے:

قَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا - انہوں نے کہا یہودی ہو جاؤ، یا نصرانی ہو جاؤ، بس تم ہدایت پاؤ گے۔

اس فریب نفس کا نشہ نزول قرآن کے وقت لوگوں پر بری طرح چھایا ہوا تھا: اور واقعات گواہ ہیں کہ آج اس نشہ کی مستی کچھ بڑھ ہی گئی ہے، کم نہیں ہوئی ہے، حتیٰ کہ اگر اعتراف حقیقت کی ہم میں جرأت ہو تو اس مستی کا خمار ہم خود اپنی آنکھوں میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی علت اس کے سوا کچھ نہیں کہ دلوں سے توحید و معاد کا صحیح تصور غائب ہے اور وہ خوش آیند تمناؤں (امانی) میں غرق ہیں۔ قرآن مجید نے ان سب کو یہ حقیقت سنادی ہے کہ نجات کا انحصار نہ تو گروہ مسلین میں داخل ہونے پر ہے، نہ گروہ یہود میں، نہ گروہ نصاریٰ میں اور نہ ہی کسی اور گروہ میں۔ مدار نجات ہے توحید اور یوم آخرت کا سچا اور زندہ ایمان اور وہ حسن عمل، جو اس ایمان کی تہوں سے خود بخود ابھرتا ہے۔ (إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرہ)) یہ آیت جہاں ایک طرف اس حقیقت کا اعلان کر رہی ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہی طاعت و بندگی کے اعتقادی اساسات ہیں، وہاں دوسری طرف امت محمدیہ پر اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم کی ایک مجسم یادگار بھی ہے کہ کس طرح اس نے اس امت کے لیئے پہلے ہی سے وہ منفذ بند کر دیا تھا جس سے پچھلی امتوں پر ضلالت، ہوا پرستی، ناخدا ترسی، شریعت الٰہی سے بے توجہی، احکام دین سے سرتابی اور فکر انجام سے بے نیازی کے فتنے ٹوٹ پڑے تھے، اور باوجود اس کے کہ اس وقت مسلمانوں کے دلوں میں اس گمراہ کن وہم کا کوئی ہلکے سے ہلکا بھی پرتو نہیں پڑا تھا مگر چونکہ آیندہ اس کا خطرہ تھا اس لئے بطور حفظ ماتقدم انہیں بھی تنبیہ کر دی کہ جس طرح مدار نجات یہودیت یا نصرانیت یا صابیت نہیں ہے اسی طرح "مسلمانیت" بھی نہیں ہے۔ پس کسی گروہ یا امت میں داخل ہو جانے ہی کو پروانۂ نجات سمجھنے کی جس غلطی نے آج ان یہود و نصاریٰ کو ڈبو رکھا ہے، کہیں وہی غلطی کل تمہیں بھی نہ ڈبو دے۔ مگر وائے بدقسمتی کہ ہم نے اس تنبیہ سے بہت کم فائدہ حاصل کیا اور اپنے کارخانۂ منطق و

دکلام کی ڈھلی ہوئی گولیوں سے اس بنا کو چھلنی کر ڈالنے کی کوششوں سے باز نہ رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ امت بھی اندیشہ ہائے بے نیازی کے نشتوں سے محفوظ نہ رہ سکی اور انجام کار آج اس کے اندر ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت دونوں کی جڑیں ہل چکی ہیں۔ اور جب ایسا ہو چکا تو تعجب نہ کرنا چاہیے اگر اس سے تقویٰ کی روح رخصت ہو چکی ہو، اگر اسے اپنا مقصد حیات فراموش ہو چکا ہو، اگر اس کے دماغ سے حق کے لئے جینے اور حق ہی کے لئے مرنے کا سودا نکل چکا ہو۔

اس صورت حال پر ہم جتنا ہی زیادہ غور کرتے ہیں، اتنا ہی زیادہ ہمیں یقین ہوتا جاتا ہے کہ ہمارے اندر گو یہ دونوں ہی بنیادی ایمانیات متزلزل ہو چکے ہیں مگر ایمان بالآخرت پر ہماری غفلتوں نے زیادہ توجہ کی ہے۔ ایمان باللہ کا وجود ابھی اس حد تک ناپید نہیں، جس قدر کہ ایمان بالآخرت کا۔ بحیثیت مجموعی اگر امت کے ایمان باللہ کی روح کو نفتہ اور مضمحل کہا جائے تو اس کے ایمان بالآخرت کی روح کو بے حس اور مفلوج کہنا چاہیے۔ اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ پچھلی تمام امتوں میں بھی یہی کچھ صورت حالات دکھائی دے رہی ہے۔ ہم قرآن میں جس قوم کا تذکرہ بھی پڑھتے ہیں اس کو خدا کا انکار کرتے ہوئے تو نہیں پاتے مگر قیامت کے معاملہ میں قریب قریب ہر قوم کی طرف سے اسی نوع کی حیرت کا اظہار دیکھتے ہیں کہ:

ءَ اِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَةِ ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۔ (نازعات - ۱)

کیا ہم (مرنے کے بعد زندگی کی) پہلی حالت میں پھر لوٹائے جائیں گے؟ کیا یہ اُس وقت (ہوگا)، جب کہ ہم گلی سڑی ہڈیاں ہو جائیں گے؟

اور اگر بعض اقوام ایسی نکلیں بھی کہ انہوں نے قیامت کا اس جزم کے ساتھ انکار نہیں کیا تو ان کا قیامت کا ماننا بھی اس انداز کا تھا کہ عمل اور نتیجہ کے اعتبار سے وہ نہ ماننے ہی کے مرادف تھا۔ اب جب یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ہر پیغمبر نے اپنی قوم کے دل و دماغ میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت دونوں کی جڑیں جمانے کی ابتدا ہی سے کوشش کی اور آخر دم تک ان جڑوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا رہا، کیونکہ یہی دونوں ایمانیات دین حق کے سنگ ہائے بنیاد ہیں، تو آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ پیغمبر کے جانے کے بعد جب اس کے پیرووں میں گمراہی نے اپنا سر نکالا تو اس کا اولین ہدف ایمان بالآخرت ہی بنا؟ ایمان باللہ کا تو کلی استیصال اس نے کبھی نہیں کیا مگر ایمان بالآخرت کے بارے میں اس نے اس وقت تک اطمینان کا سانس نہیں لیا جب تک کہ لوگوں کے دماغ کے ایک ایک ریشے سے اس کے امکان کے تصور کو جڑ بنیاد سے کھود کر پھینک نہ دیا؟ خدا کے بارے میں تو وہ اس بات پر آکر بالکلیہ راضی ہو گئی کہ اسے خالق کا ماننا

اور رب اعلیٰ مانا جائے، ہاں صرف شرط یہ تھی کہ اس کے نیچے بھی چھوٹی چھوٹی خدائیوں کے کچھ عہدے تسلیم کر لیئے جائیں، مگر قیامت کے متعلق اس نے کسی قسم کی رواداری نہیں دکھائی اور اس کے لیے ذہن انسانی میں کسی امکان کا وہم بھی باقی رہنا اس نے گوارا نہیں کیا۔ اس کی وجہ کا سراغ لگانے والا اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں پا سکتا کہ ......

.... نفس انسانی پر شرائع الٰہیہ کی پابندیاں ہمیشہ گراں گذرتی ہیں اس لئے وہ ہر آن ان سے راہ فرار اختیار کرنے کی سعی کرتا ہے اس سعی میں قیامت کا تصور سب سے بھاری رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ اپنے تمام شیطانی حربوں اور تدبیروں کو اس رکاوٹ کے ہٹا پھینکنے میں صرف کر ڈالتا ہے، اور پھر دم اس وقت لیتا ہے جب اس رکاوٹ کو اپنے راستہ سے بالکل ہی ہٹا دے، یا اگر کچھ رعایت کرتا بھی ہے تو بس اسی حد تک جس حد تک کہ آج کل انگریزی حکومت نے "دین اسلام" کو اپنے وجود کے اظہار کی رعایت دے رکھی ہے۔ جس ایمان بالآخرت کا رشتہ انسانی زندگی کے رویہ سے یکسر کٹا ہوا ہو اس کو ایمان کہنا ایمان کی توہین نہیں تو اور کیا ہے۔

نفس امارہ نے اپنی اس سنت کا اعادہ امت محمدیہ کے اندر بھی بعینہٖ اسی طریقہ سے کیا ہے جس طرح پچھلی امتوں میں کرتی رہی ہے۔ خدا کے وجود سے انکار تو خال خال ہی نظر آتا ہے اور توحید کے اقرار سے بھی قلوب ایک بڑی حد تک معمور ہیں، مگر ایک روز جزا کے آنے کے یقین، محاسبۂ اعمال کے اندیشے اور آخرت کی بازپرس کے خوف سے دلوں کی بستیاں اس طرح اجڑ گئی ہیں جس طرح کسی زبردست بھونچال کے بعد انسانی آبادیاں اُجڑ جاتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ زبان سے قیامت کا انکار کرنے والے مسلمان آپ کو شاید ہی ملیں گے، مگر اس عدم انکار کے پیچھے خوف آخرت کے وہ کون سے عملی شواہد ہیں جن کی بنا پر آپ اس "اقرار کو ایمان" کہہ سکیں؟ اگر کُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصَارٰی تَهْتَدُوْا کے گمان باطل نے چشم بصیرت پر تعصب کی پٹی نہیں باندھ دی ہے تو آپ کو اعتراف کرنا چاہیئے کہ آج ہم ایمان بالآخرت کا دعویٰ رکھنے کے باوجود وہی سب کچھ کر رہے ہیں جو ایک خوف جزاء و سزا سے بے پروا انسان کیا کرتا ہے۔ ایک دیدۂ بینا دنیا پرستی، مصلحت کوشی، افادیت پسندی اور حدود شریعت سے گریزپائی کے اس خوفناک سیلاب کا کیونکر انکار کر سکتی ہے جو دلوں پر چھاتا چلا جا رہا ہے اور جس کے اندر ایمان بالآخرت ایک تنکے کی طرح بہتا نظر آ رہا ہے؟

یہود کی مثال یہ حقیقت، کہ خدا کے نزدیک وہی ایمان بالآخرت معتبر ہے جو اپنی پشت پر حسن عمل اور پابندی شرع

کی مضبوط شہادتیں رکھتا ہو، قرآن مجید کی مرتب کردہ اُس فردِ قرار دادِ جرم کے اندر پوری طرح نمایاں ہے جو اس نے یہودیوں کے خلاف عاید کی ہے۔ قوم یہود وہ قوم ہے جو قیامت کو زبانی طور پر ماننے، اور عملی طور پر نہ ماننے کی کیفیت کی آئینہ تصویر ہے۔ ان یہودیوں کا کہنا تو یہ تھا کہ ایک روز جزا آنے والا ہے، اس کہنے کا تقاضا یہ تھا کہ اس دن کے لیے تیاری کرتے اور خدا کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے خیال سے اندیشہ ناک رہتے اور اس کے لیے احکام الٰہی کی پیروی میں بیش از بیش سرگرمی سے کام لیتے، مگر ان کی رگوں میں جو نفس پرستی اور دنیا طلبی رچ بس گئی تھی وہ اس تقاضے کو پورا کیسے ہونے دیتی۔ اس لیے انہوں نے خدا اور اس کی شریعت کو فریب دینے کی تدبیریں کیں اور اب ایک روز جزاء آنے کا عقیدہ اِس طرح کی ایک "سیاسی تھیوری" بن گیا:-

(ا) ہم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں (اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔ بقرہ ۱)۔ (نُؤْمِنُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْنَا۔ بقرہ)۔

(ب) لیکن ہم اس کے بیٹے اور چہیتے ہیں (نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ۔ مائدہ ۳)۔

(ج) اس لیے خواہ ہم کتنی ہی نافرمانی کریں وہ ہمیں ضرور بخش دے گا (سَیُغْفَرُ لَنَا۔ اعراف ۲۱) یا اگر کچھ سزا دی بھی تو وہ گنتی کے دنوں سے زیادہ نہ ہوگی (لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً۔ بقرہ ۹)

اس سیاسی تھیوری نے ان کے لیے فسق و فجور اور دنیا پرستی کے دروازے جس طرح چوپٹ کھول دیئے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح آخرت کا ماننا، نہ ماننا دونوں یکساں تھا۔ چنانچہ گو وہ لاکھ چلاتے رہے کہ ہم قیامت کو مانتے ہیں مگر قرآن نے ان کے اس دعوے کو بے حقیقت قرار دیا، اور ان پر کنایۃً یہ الزام لگائے بغیر نہ رہا کہ روز جزا کے یقین سے انہیں کوئی سروکار نہیں، جیسا کہ سورہ بقرہ کے، جس کا تخاطب یہود کی طرف ہے اور جو ان یہودیوں پر رسالت محمدی کی حجت قائم اور تمام کرتی ہے، اس کے ابتدائی پیراگراف سے مترشح ہوتا ہے؛ جہاں خدا کے متقی بندوں کی صفات بیان کرتے کرتے مقطع کی بات یہ کہی گئی ہے کہ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ۔ (یعنی قرآن سے وہی لوگ ہدایت پا سکتے ہیں جو آخرت کا سچا یقین بھی رکھتے ہوں) اس جملہ میں صریحاً یہودیوں کے ادعائے ایمان پر تعریض کی گئی ہے اور ان کے اُس اُم الامراض کی طرف انگلی اٹھا دی گئی ہے جو ہدایت قرآنی سے ان کی محرومی کا اصل سبب ہے۔ یعنی یہ کہ اگرچہ قرآن سراپا ہدایت ہے مگر یہ ہدایت انہی لوگوں کو ملتی ہے جو خدا پر ایمان رکھنے

ہوں، نماز قائم کرتے ہوں، راہ حق میں اپنا مال خرچ کرتے ہوں اور آخر میں یہ کہ ان کے سینوں میں آخرت کا ڈر بھی ہو، مگر چونکہ یہ لوگ یقین آخرت سے محروم ہو چکے ہیں اس لئے قرآن پر نہ وہ ایمان لائیں گے نہ قرآن کی ہدایت ان کے حق میں ہدایت ہے۔ اسی طرح قرآن جگہ جگہ ان کو جھنجھوڑتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارے سینے میرے خوف سے کیوں خالی ہو گئے ہیں، کیوں نہیں آخرت کی بے لاگ باز پرس کی تم فکر کرتے (وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ۔ بقرہ ۱۵۰) دنیا کے خوف اور لالچ سے تمہارے دل اٹے پڑے ہیں مگر میری دہشت یا میری محبت کا ان میں کوئی گذر نہیں، حالانکہ خوف مجھ سے اور صرف مجھ ہی سے کھانا چاہیے تھا (وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنَ) غرض قرآن نے ان کے خلاف جو کچھ کہا ہے اس کا انداز بیان ایسا ہے جو علانیہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اسے ان لوگوں کا دعوائے ایمان بالآخرت تسلیم نہیں، کیونکہ ان کی زندگی کا سارا رویہ اپنے اندر اس زبانی دعوے کی صداقت پر ایک دلیل بھی نہیں رکھتا۔ اس سلسلہ میں لطف کی بات یہ ہے کہ ان اشقیاء نے نہ جانے کب دنیا پرستی کے جوش میں اس نام نہاد عقیدۂ آخرت کے خیالی اندیشوں سے بھی اپنا دماغ خالی کر لیا اور اس وقت جو تورات ہمارے سامنے ہے اس میں اس عقیدہ کی کوئی واضح تعلیم سرے سے ملتی ہی نہیں۔

(باقی)